مختصر یہ کہ بہن مریم جمیلہ تقریباً دس سال تک انگریزی زبان میں دستیاب اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کرتی رہیں۔ بعد میں آپ نے مولانا مودودی سے بھی خط کتابت کی۔ محترمہ جمیلہ کو مسلمان بنانے کے لیے مولانا مودودی رحمہ اللہ کو دعوت وتبلیغ کی ضرورت نہ پڑی کیونکہ محترمہ پہلے ہی قبول اسلام کی دہلیز پر پہنچ چکی تھیں اور مولانا کے علم کے بغیر ہی اس سلسلے میں آخری قدم اٹھانے والی تھیں۔ علاوہ ازیں آپ کی تحریروں پر بھی مولانا مودودی رحمہ اللہ کا کوئی فیصلہ کن اثر نہ پڑ سکا کیونکہ آپ مولانا سے واقف ہونے سے ایک سال سے زیادہ عرصہ پہلے ہی اسلام کے دفاع میں مضامین لکھنے کا آغاز کر چکی تھیں اور آپ کے عقائد کی بنیادیں' دونوں کو ایک دوسرے کا علم ہونے سے بہت پہلے ہی' مستحکم ہو چکی تھیں۔ قبول اسلام سے پہلے ہی آپ نے اپنے آپ کو اسلام کے لیے وقف کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا' چنانچہ 5 دسمبر 1960ء کو نیویارک سے مولانا مودودی رحمہ اللہ کے نام ایک خط میں آپ نے لکھا:

''گزشتہ سال میں نے دریافت کیا ہے کہ مادہ پرستانہ فلسفے' سیکولرازم اور قوم پرستی' جن کا آج کی دنیا میں بہت چرچا ہے اور جو نہ صرف اسلام بلکہ پوری نسل انسانی کی بقا کے لیے خطرہ بن گئے ہیں' ان کے خلاف جدوجہد کے لیے میں خود کو وقف کرنا چاہتی ہوں۔ اس مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے پہلے ہی بہت سے مضامین اور کالم لکھے ہیں۔ میں 26 سالہ جوان امریکی عورت ہوں اور اس قدر شدت سے اسلام کی طرف راغب ہوں، جو کہ دنیا کے لیے امید کی کرن ہے' کہ میں مسلمان ہو جانا چاہتی ہوں۔''

اس خط کا جواب مولانا مودودی رحمہ اللہ نے 21 جنوری 1961ء کو لکھا:

''مجھے یقین ہے کہ آپ پہلے ہی سے مسلم خاتون ہیں اگرچہ آپ ابھی اسلام قبول کرنے کا سوچ رہی ہیں۔ جو مرد یا عورت اللہ تعالیٰ کی وحدانیت' حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے' قرآن کریم کے اللہ تعالیٰ کا کلام ہونے اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے وہ حقیقی مسلمان ہے' چاہے وہ یہودی' عیسائی یا کسی اور غیر مسلم گھرانے میں

پیدا ہوا ہو۔ آپ کے خیالات مذکورہ عقائد پر آپ کے ایمان کے شاہد ہیں' اس لیے میں آپ کو ایک مسلمہ اور اپنی مومنہ بہن سمجھتا ہوں۔ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے لیے بپتسمہ یا کسی پادری کے سامنے تبدیلیٔ مذہب کی کوئی رسم ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ کو ابدی صداقت ''اسلام'' کی حقانیت پر یقین واطمینان ہے تو آپ کا دل سے اس بات کا اقرار کافی ہے: [لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ] ''اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور محمد (ﷺ) اس کے رسول ہیں۔ مزید برآں آپ کو کوئی اسلامی نام جیسے عائشہ' فاطمہ وغیرہ رکھ لینا چاہیے۔ اس کے بعد آپ عوام میں اپنے نام اور قبول اسلام کا اعلان کردیں تاکہ مسلم دنیا کو علم ہوجائے کہ آپ بھی ان کی مسلم برادری کی ایک رکن ہیں۔''

اسلام قبول کرنے کے بعد مریم جمیلہ نے مولانا مودودی رحمہ اللہ کو ایک خط لکھا جس میں یہ واضح کیا:

''پانچ روز قبل عید الاضحیٰ کی نماز کے بعد میں نے اپنے دو مسلمان بھائیوں کی موجودگی میں کلمۂ شہادت پڑھا اور اب میں ایک مکمل مسلمہ عورت ہوں۔ پھر میں نے بروکلین (Brooklyn) میں اسلامک مشن آف امریکہ (Islamic Mission of America) کے شیخ داود احمد فیصل سے اپنے قبول اسلام کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ میرا اسلامی نام مریم جمیلہ ہے اور اب میں اپنی تمام خط کتابت اور تحریروں میں یہی نام لکھوں گی۔''

مولانا مودودی رحمہ اللہ کو 7/اپریل 1962ء کو لکھے گئے ایک اور خط میں اپنے قبول اسلام کا تذکرہ کچھ اس طرح کرتی ہیں:

''میں نے بلاشبہ زندگی میں بہت سی غلطیاں اور احمقانہ کام کیے ہیں مگر مجھے یقین ہے کہ میرا قبول اسلام میری سرگرمیوں میں سب سے مثبت' سب سے زیادہ تعمیری اور سب سے زیادہ عقلمندانہ اقدام ہے۔ مجھے اس بات پر بغیر کسی شک وشبہ کے یقین ہے کہ اسلام ذہنی صحت کے لیے مؤثر ترین دوا ہے۔ مولانا صاحب کا یہ خیال حق بجانب ہے کہ یہودیت وعیسائیت سے تائب ہوکر اسلام قبول کرنے کا مطلب مغربی تہذیب

ومعاشرت کو چھوڑ کر اسلامی تہذیب میں آجانا اور تہ دل سے ایک یکسر مختلف طرز زندگی اختیار کر لینا ہے۔''

محترمہ مریم جمیلہ کی قابل ذکر بات یہ ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لیے وقف کر دیا ہے۔ انہوں نے دو درجن سے زیادہ کتب لکھیں جو عالمی شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ پریس میں ان کی کتب کا مختصر تعارف یوں ہوا:

1) "Islam versus the West" (اسلام اور مغرب): ''مریم جمیلہ سابق مارگریٹ مارکس (Margaret Marcus) اب اسلامی دنیا کی ایک معروف رکن ہیں۔ وہ اسلام کے حلقے کے اندر مغرب کے نام نہاد پرچارکوں کی سخت مخالف ہیں اور مدلّل طور پر ان کی تردید کرتی ہیں۔ وہ دلائل سے ثابت کرتی ہیں کہ اسلامی تہذیب اپنے اساسی اصول قربان کیے بغیر پھلنے پھولنے اور ٹیکنو کریٹک (Technocratic) تہذیب کے فروغ میں اپنا کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔'' (Daily Dawn- Karachi)

2) "Islam and Modernism" (اسلام اور جدت پسندی): ''وہ خالص اسلام کی علمبردار ہیں۔ وہ اس بات کی ضرورت پر بھی زور دیتی ہیں کہ اسلامی تاریخ کو خالص اسلام کی روشنی میں مرتب کیا جائے۔ اسلوب ذرا تلخ ہے مگر دلچسپ انداز نے کتاب کے مطالعے کو بہت مفید بنا دیا ہے۔ یقیناً یہ مطالعے کے قابل اور دل ودماغ کو روشن کرنے والی کتاب ہے۔ تمام سچے مسلمانوں کی طرح مصنفہ تبلیغ کے ساتھ عمل کو لازم قرار دیتی ہیں۔''

(The Pakistan Observer, Dacca` and "The Criterion" Karachi)

3) "Islam in Theory and Practice" (اسلام نظریے اور عمل کے تناظر میں):

''امریکہ کی یہودیت سے مسلمان ہونے والی نئی مُسلمہ اس بات پر زور دیتی ہیں کہ اسلام کے غلبے کا دن دور نہیں' بشرطیکہ مسلمان اپنے مقام کو پہچان لیں اور تقدیر پر ایمان رکھیں' اسلام کی اساسی تعلیمات پر عمل کریں' اللہ کے احکام اپنی زندگی کے ہر شعبے میں جاری وساری کرنے اور اسلام کو اس کی مکمل شکل میں اپنی تہذیب' سیاست' معیشت اور

پیدا ہوا ہو۔ آپ کے خیالات مذکورہ عقائد پر آپ کے ایمان کے شاہد ہیں' اس لیے میں آپ کو ایک مسلمہ اور اپنی مومنہ بہن سمجھتا ہوں۔ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے لیے بپتسمہ یا کسی پادری کے سامنے تبدیلیٔ مذہب کی کوئی رسم ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ کو ابدی صداقت ''اسلام'' کی حقانیت پر یقین واطمینان ہے تو آپ کا دل سے اس بات کا اقرار کافی ہے: [لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ] ''اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور محمد (ﷺ) اس کے رسول ہیں۔ مزید برآں آپ کو کوئی اسلامی نام جیسے عائشہ' فاطمہ وغیرہ رکھ لینا چاہیے۔ اس کے بعد آپ عوام میں اپنے نام اور قبول اسلام کا اعلان کر دیں تا کہ مسلم دنیا کو علم ہو جائے کہ آپ بھی ان کی مسلم برادری کی ایک رکن ہیں۔''

اسلام قبول کرنے کے بعد مریم جمیلہ نے مولانا مودودی رحمہ اللہ کو ایک خط لکھا جس میں یہ واضح کیا:

''پانچ روز قبل عید الاضحیٰ کی نماز کے بعد میں نے اپنے دو مسلمان بھائیوں کی موجودگی میں کلمۂ شہادت پڑھا اور اب میں ایک مکمل مسلمہ عورت ہوں۔ پھر میں نے بروکلین (Brooklyn) میں اسلامک مشن آف امریکہ (Islamic Mission of America) کے شیخ داود احمد فیصل سے اپنے قبول اسلام کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ میرا اسلامی نام مریم جمیلہ ہے اور اب میں اپنی تمام خط کتابت اور تحریروں میں یہی نام لکھوں گی۔''

مولانا مودودی رحمہ اللہ کو 7 اپریل 1962ء کو لکھے گئے ایک اور خط میں اپنے قبول اسلام کا تذکرہ کچھ اس طرح کرتی ہیں:

''میں نے بلاشبہ زندگی میں بہت سی غلطیاں اور احمقانہ کام کیے ہیں مگر مجھے یقین ہے کہ میرا قبول اسلام میری سرگرمیوں میں سب سے مثبت' سب سے زیادہ تعمیری اور سب سے زیادہ عقلمندانہ اقدام ہے۔ مجھے اس بات پر بغیر کسی شک وشبہ کے یقین ہے کہ اسلام ذہنی صحت کے لیے مؤثر ترین دوا ہے۔ مولانا صاحب کا یہ خیال حق بجانب ہے کہ یہودیت وعیسائیت سے تائب ہو کر اسلام قبول کرنے کا مطلب مغربی تہذیب

ومعاشرت کو چھوڑ کر اسلامی تہذیب میں آ جانا اور تہ دل سے ایک یکسر مختلف طرز زندگی اختیار کر لینا ہے۔"

محترمہ مریم جمیلہ کی قابل ذکر بات یہ ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لیے وقف کر دیا ہے۔ انہوں نے دو درجن سے زیادہ کتب لکھیں جو عالمی شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ پریس میں ان کی کتب کا مختصر تعارف یوں ہوا:

1) "Islam versus the West" (اسلام اور مغرب): "مریم جمیلہ سابق مارگریٹ مارکس (Margaret Marcus) اب اسلامی دنیا کی ایک معروف رکن ہیں۔ وہ اسلام کے حلقے کے اندر مغرب کے نام نہاد پرچارکوں کی سخت مخالف ہیں اور مدلّل طور پر ان کی تردید کرتی ہیں۔ وہ دلائل سے ثابت کرتی ہیں کہ اسلامی تہذیب اپنے اساسی اصول قربان کیے بغیر پھلنے پھولنے اور ٹیکنو کریٹک (Technocratic) تہذیب کے فروغ میں اپنا کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔" (Daily Dawn- Karachi)

2) "Islam and Modernism" (اسلام اور جدت پسندی): "وہ خالص اسلام کی علمبردار ہیں۔ وہ اس بات کی ضرورت پر بھی زور دیتی ہیں کہ اسلامی تاریخ کو خالص اسلام کی روشنی میں مرتب کیا جائے۔ اسلوب ذرا تلخ ہے مگر دلچسپ انداز نے کتاب کے مطالعے کو بہت مفید بنا دیا ہے۔ یقیناً یہ مطالعے کے قابل اور دل ودماغ کو روشن کرنے والی کتاب ہے۔ تمام سچے مسلمانوں کی طرح مصنّفہ تبلیغ کے ساتھ عمل کو لازم قرار دیتی ہیں۔"

(The Pakistan Observer, Dacca` and "The Criterion" Karachi)

3) "Islam in Theory and Practice" (اسلام نظریے اور عمل کے تناظر میں):

"امریکہ کی یہودیت سے مسلمان ہونے والی نئی مُسلمہ اس بات پر زور دیتی ہیں کہ اسلام کے غلبے کا دن دور نہیں' بشرطیکہ مسلمان اپنے مقام کو پہچان لیں اور تقدیر پر ایمان رکھیں' اسلام کی اساسی تعلیمات پر عمل کریں' اللہ کے احکام اپنی زندگی کے ہر شعبے میں جاری وساری کرنے اور اسلام کو اس کی مکمل شکل میں اپنی تہذیب' سیاست' معیشت اور

معاشرت میں نافذ کرنے کی کوشش کریں۔("The Criterion" Karachi)

4) "Islam versus Ahl Al-kitab; Past and Present" (اسلام اور اہلِ کتاب کا تقابل' ماضی اور حال کے آئینے میں): ''انہوں نے ایک یہودی خاندان میں پرورش پائی اور پروان چڑھیں، مسیحی امریکہ میں یہودی اقلیت کی رکن رہیں اور اس کے بعد اسلام قبول کیا۔ وہ اسلام کو انسانیت کے واحد حقیقی مذہب کے طور پر پیش کرتی ہیں جو انسانیت میں اتحاد پیدا کرسکتا ہے۔ یہ کتاب مریم جمیلہ کی تحریروں میں سب سے اچھی کتاب ہے۔'' ("The Muslim" London)

[ہم یہاں مریم جمیلہ کے دو بہترین سوانحی مضامین پیش کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں جو نومسلموں سے عام طور پر کیے جانے والے سوالات کا جواب ہیں۔] (مرتب)

میرے قبول اسلام کا پس منظر

بچپن ہی سے میرے نظریات مذہبی تھے' حتیٰ کہ ابتدائے بلوغت اور جوانی میں بھی مجھے مذہب سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ اس دور میں یہودیت اور عیسائیت کے نظریات سے بے زار ہوکر میں دہریت کی طرف مائل ہونے لگی کیونکہ مجھے اس ابدی سچائی کی تلاش تھی جو انسانی زندگی کو مفہوم' مقصد اور سمت عطا کرتی ہے۔ مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ مادی اور روحانی نظریات کے درمیان بنیادی فرق ارفع دینی' اخلاقی' سماجی اور قانونی اقدار پر یقین رکھنا ہے۔ دور حاضر اور دور ماضی کے تمام مادیت پرست افراد اور اقوام کا مقصدِ حیات محض دنیاوی لذتوں اور مسرّتوں کا حصول رہا ہے۔ مادیت پرست ہر جگہ وقتی اور عارضی لذتوں' خوشیوں اور مفادات کو اہمیت دیتا ہے۔ دولت کی پرستش اس کی افادیت کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ جوں ہی کوئی فرد اپنے آپ سے حتمی صداقتوں کے بارے میں سوال کرتا ہے اور موت وحیات کے معنیٰ' مقصد اور زندگی کی مختلف جہتوں کے بارے میں جستجو کرتا ہے تو وہ مذہب کے دائرۂ کار میں داخل ہوجاتا ہے جہاں طبعی وسائنسی علوم ہماری کوئی مدد نہیں کرسکتے۔ مادیت پرست ہمیشہ فانی اور عارضی

اقدار سے واسطہ رکھتے ہیں جبکہ خالص روحانی نقطۂ نظر سے کامل اور دائمی اقدار منزل مقصود ٹھہرتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آج کے پُر آشوب اور اخلاقی زوال کے اس دور میں ہمیں جتنے مسائل کا سامنا ہے اور جو خوفناک اخلاقی انحطاط' سماجی انتشار اور اپنے عزیزوں' دوستوں اور اپنے خاندان کے رشتوں میں زوال در آیا ہے' اس کی بنیادی وجہ روحانی اقدار' معیارات اور نصب العین کے معاملے میں خلوص کا فقدان ہے۔ موجودہ فنون اور ثقافت کی خرابی بھی اسی وجہ سے ہے۔ آج کے انسان کو کسی حقیقی مقتدرِ اعلیٰ پر ایمان کی اشد ضرورت ہے تاکہ وہ اچھے اور برے' درست اور غلط میں تمیز کر سکے، حسن و قبح کی پہچان کر سکے اور اہم اور غیر اہم میں فرق کر سکے۔ صرف اللہ تعالیٰ کا قانونِ کامل اور ضابطۂ اخلاق ہی تمام انسانوں کے لیے وقار، عزت و آبرو' تقویٰ اور اطاعت کا ضامن ہے۔ مادی اور لادینی قانون سے یہ بات ممکن نہیں کیونکہ لوگ کسی ایسے قانون کا احترام کیسے کر سکتے ہیں جسے کل ووٹوں کی مدد سے ناکارہ قرار دے دیا جائے۔ اسلامی ضابطۂ اخلاق اور قانون اللہ کے اختیار میں ہے' اس لیے لوگ ان قوانین کا احترام کرتے ہیں اور ان کی اطاعت بھی کرتے ہیں۔ اسلامی احکام خوفِ الٰہی کا احساس دلاتے ہیں کیونکہ یہ دنیا اور آخرت دونوں میں نافرمانوں کے لیے سخت سزاؤں کی وعید سناتے ہیں۔ میں نے ''تبدیلی'' کو بذاتہ کبھی ایک خوبی نہیں سمجھا۔ میرے خیال میں کسی چیز میں دوام اور پائیداری کا نہ ہونا انسانی وجود کی قدر و قیمت کے انکار کے مترادف ہے اور اس کے بغیر زندگی محض بے وقعت' سطحی اور بے معنی ہے۔ میں ہمیشہ ابدی اور کامل سچائیوں کی تلاش میں رہی۔

یہودیت اور عیسائیت جیسے مذاہب مجھے مطمئن نہ کر سکے۔ میں یہودیت اور اس کے علماء کی تنگ نظری اور قوم و نسل پرستی سے متنفر ہوگئی اور فلسطینی عربوں پر ان کے ہولناک مظالم نے میری آنکھیں کھول دیں، حالانکہ فلسطینی عرب اپنے موقف میں حق بجانب ہیں اور باوقار لوگ ہیں حتی کہ متشدد یہودی بھی فلسطینیوں کی اخلاقی خوبیوں کے قائل اور معترف ہیں۔

عیسائیت کے پیچیدہ اور سمجھ سے بالاتر فلسفۂ دین سے میں کبھی مطمئن نہ ہو سکی۔ عیسائی چرچ بہت سی اخلاقی' سماجی' سیاسی اور معاشی برائیوں کا محور ہے' جبکہ یورپ میں اس کے عہدِ اقتدار

کے مظالم کو تاریخ انسانی کا سیاہ باب کہنا چاہیے۔ بچپن میں جب مجھے نیویارک میں یہودیت کی تعلیم و تربیت دی جارہی تھی تو یہ فطری امر تھا کہ میں تاریخی لحاظ سے یہودیت کے سب سے زیادہ قریب مذہب (اسلام) کے متعلق جاننے کی خواہش رکھتی تھی۔ مجھے پتہ چلا کہ میں اسلام اور اس کی تہذیب کا مطالعہ کیے بغیر بھی عربوں کے بارے میں معلومات حاصل کرسکتی ہوں اور جوں ہی مجھے یہ معلوم ہوا کہ عربوں نے اسلام کو عظمت نہیں بخشی بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے' تو میرے دل میں اس مذہب کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہش پیدا ہوگئی۔ میرے خیال میں قرآن کی بائبل پر فضیلت اس کی آفاقی حیثیت کی وجہ سے ہے جس کے مقابلے میں یہودیت کی تعلیمات قوم و نسل پرستی کے تنگ نظر تصورات پر مبنی ہیں جن کے باعث یہودی اپنی قبائلی ذہنیت سے باہر نہیں نکل سکے۔ چونکہ وسیع النظری اور عالمگیریت سے اعلیٰ اخلاقی اقدار جنم لیتی ہیں اس لیے اس نے ان مذاہب اور ان سے پروان چڑھنے والی تہذیبوں کے تاریخی ارتقاء پر شدید اثرات مرتب کیے ہیں۔

ابدی اقدار کے متعلق میری تڑپ کی تسکین صرف اسلام ہی سے ہوئی۔ سچائی' نیکی اور خوبصورتی کی قدریں جن سے انسانی زندگی اور موت کو مقصد اور سمت میسر آتی ہے، مجھے اسلام ہی میں ملیں جبکہ دوسرے مذاہب میں سچائی کو مسخ' محدود اور ٹکڑے ٹکڑے کردیا جاتا ہے۔ اب اگر کوئی مجھ سے یہ پوچھے کہ مجھے ان باتوں کا علم کیسے ہوا تو میں صرف یہی جواب دے سکتی ہوں کہ میرا ذاتی مشاہدۂ حیات مجھے قائل کرنے کے لیے کافی تھا' لہٰذا اسلام سے میری وابستگی ایک پرسکون اور محکم یقین کی بنا پر قائم ہے۔ بعض دوسرے نومسلموں کی طرح مجھے کبھی خوابوں میں نبیٔ اکرم ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی نہ کبھی تصوف کے تجربات ہوئے اور نہ کوئی ڈرامائی صورت حال میرے قبولِ اسلام کا باعث بنی۔

اب میں یہ سمجھتی ہوں کہ میں دل اور مزاج کے لحاظ سے ہمیشہ ہی مسلمان رہی ہوں اور اس وقت بھی مسلمان تھی جب مجھے یہ علم بھی نہ تھا کہ اسلام کیا ہے۔ میرا قبول اسلام تو ایک رسمی سی بات ہے اور اس سلسلے میں میرے دل میں کوئی انقلابی تبدیلی رونما نہ ہوئی۔ بس یوں سمجھیے کہ وہ

باتیں جن پر میں ایک عرصہ سے غور کررہی تھی اور وہ خواہشات جو ایک عرصے سے میرے دل میں موجود تھیں، قبول اسلام نے انہیں سند قبولیت عطا کردی۔

نبیٔ کریم ﷺ اور آپ کے بعد تمام سچے مسلمانوں کا مقصد حیات کامیابیوں کا حصول تھا اور محض لطف اندوز ہونا ان کا مقصد نہ تھا۔ اسلام میں مسرت اور اطمینان عاقبت میں نجات کے لیے اللہ کے احکام کی اطاعت سے حاصل شدہ جذباتی تسکین کا فطری نتیجہ ہیں۔ اسلام میں فرائض کو حقوق پر ہمیشہ ترجیح دی جاتی ہے۔ مادہ پرست دنیا میں سیاسی یا معاشی قوت کو کامیابی کہا جاتا ہے' یا سائنس' فنون لطیفہ اور مختلف پیشوں میں ترقی اور حصول شہرت کو کامیابی کا نام دیا جاتا ہے۔ اس طرح ہر باصلاحیت مالدار شخص جو کسی کاروبار یا تجارت سے بہت دولت جمع کرلے اسے کامیاب قرار دیا جاتا ہے۔ اسلام میں کامیابی کا معیار یہ ہے کہ دیرپا، کارآمد اور نفع بخش کام انجام دیا جائے خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا ہو اور گناہوں سے اپنی خواہشات کی تکمیل میں وقت ضائع نہ کیا جائے۔ نبیٔ اکرم ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی نظر میں تجربے کی گہرائی کی اہمیت تجربے کی وسعت سے زیادہ تھی۔ آج کی تیز رفتار اور مشینی انداز زندگی اور مسلسل نقل و حرکت کے باعث لوگوں کے تجربے میں وسعت تو ضرور ہوتی ہے مگر غور وفکر کے لیے وقت نہ ملنے کے باعث ان کی سوچ سطحی اور گہرائی سے محروم ہوتی ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن وسنت پر مبنی شریعت یا اسلام کے سخت مذہبی' اخلاقی اور سماجی قوانین سے زندگی محدود اور پابند ہو جاتی ہے' ان سے میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر یہ کہنا چاہوں گی کہ آج کے کئی خوش حال اور جدت پسند لوگ بدحال اور پریشان ہیں اگرچہ انہیں کچھ بھی کرنے کی کھلی اجازت ہے۔

تاریخ میں ان جیسا بلند معیارِ زندگی کم ہی کسی کو حاصل رہا ہے۔ انہیں بہترین لباس' بہترین تعلیم' بہترین غذا اور بہترین رہائش میسر ہے' مردوں اور عورتوں کو مکمل آزادی حاصل ہے' ان کی سیکولر تعلیم نے ان کے سماجی تعلقات پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ وہ جو چاہیں انہیں کرنے کی اجازت ہے' انہیں اپنی ذات کو ہر طرح سے ترقی دینے کے وسیع مواقع میسر ہیں' پھر بھی ان تمام تر مادی مفادات اور مواقع کے باوجود جدید دور کے بے شمار لوگ بے چین' غیر مطمئن اور

اعصابی عوارض میں مبتلا ہیں۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری زندگی کا اولین مقصد یہ ہے کہ اسے ضائع نہ کروں۔ میرا ہر کھرے مسلمان کی طرح طویل المیعاد وحتمی مقصد حیات یہ ہے کہ قرآن وسنت پر عمل کر کے اللہ کی رضا اور قبولیت کے ذریعے آخرت میں نجات نصیب ہو جائے۔

[بیگم مریم جمیلہ' سابقہ مارگریٹ مارکس، نیویارک، حال مقیم لاہور]

(Maryam Jameelah Begum,Formerly Margaret Marcus)

میں نے اسلام کیوں قبول کیا؟

اسلام سے میری دلچسپی اس دور میں پیدا ہوئی جب میں یہودیوں کے 'سنڈے سکول' (Sunday School) کی طالبہ تھی۔ مجھے یہودیوں اور عربوں کے باہمی تاریخی تعلقات کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔ یہودیوں کی نصابی کتب سے مجھے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تمام عربوں اور یہودیوں کے جدّ امجد تھے۔ میں نے ان کتب میں پڑھا کہ کئی صدیوں کے بعد جب قرونِ وسطیٰ میں یورپ کے عیسائیوں نے یہودیوں کی زندگی ان پر تنگ کر دی تو مسلمان ریاست سپین میں یہودیوں کو پناہ ملی اور عرب مسلم تہذیب کی فراخ دلی نے یہودی تمدن کو اس کے درجۂ کمال تک پہنچنے کا موقع دیا۔ یہودیت کی اصل فطرت سے ناواقفیت کے باعث میں یہ سمجھتی تھی کہ یہودی فلسطین واپس جا کر عرب بھائیوں سے اپنے قریبی' قومی ومذہبی رشتوں کو بحال کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ یہودی اور عرب مل کر مشرق وسطیٰ میں پھر ایک سنہری دورِ تہذیب وترقی کو بروئے کار لائیں گے۔

یہودیت کی تاریخ سے دلچسپی کے باوجود میں سنڈے سکول (Sunday School) میں نہایت ناخوش تھی۔ اس دور میں' میں اپنے آپ کو یورپ کے یہودی معاشرے کی ایک رکن سمجھتی تھی جو اس وقت نازیوں (Nazis)[1] کے ہاتھوں تباہ وبرباد ہو رہا تھا۔ مجھے یہ جان کر شدید

---

[1] جرمنی کی نیشنل سوشلسٹ پارٹی کے ارکان جس نے 1933ء میں اڈولف ہٹلر کے تحت سیاسی اقتدار حاصل کیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم (45-1939ء) میں شکست کے بعد نازی حرفِ غلط کی طرح مٹ گئے۔ (م ف)

صدمہ ہوا کہ میرے ہم جماعت طلبہ کو مذہب سے کوئی دلچسپی تھی نہ ان کے والدین کو۔

یہودی بیعہ (Synagogue) میں عبادت کے دوران میں بچے اپنی دعاؤں کی کتابوں میں رکھے ہوئے کارٹون دیکھا کرتے تھے اور رسومِ عبادت کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ بچے اتنا شور مچاتے تھے اور اتنی بدتمیزی کا مظاہرہ کرتے تھے کہ اساتذہ انہیں قابو نہ کر سکنے کی وجہ سے صحیح طور پر پڑھا بھی نہیں سکتے تھے۔ گھر پر بھی مذہب پہ عمل کرنے کے لیے ماحول سازگار نہ تھا۔ میری بڑی بہن کو ''سنڈے سکول'' سے نفرت تھی کیوں کہ میری والدہ اسے گھسیٹ کر زبردستی بستر سے اٹھاتی تھی اور وہ کبھی رونے دھونے اور تلخ کلامی کے بغیر سکول نہیں جاتی تھی۔ آخر کار میرے والدین نے تنگ آ کر اس سے سکول چھڑوا دیا۔ یہودیوں کے مقدس ایّام میں بیعہ (یہودی عبادت گاہ) جانے اور 'یوم کپور'[1] (Yom Kippur) کا روزہ رکھنے کے بجائے میری بہن کو اور مجھے سکول سے باہر سیر و تفریح کے لیے لے جایا جاتا۔ جب ہم دونوں بہنوں نے والدین پر یہ واضح کر دیا کہ ہمیں سنڈے سکول میں کتنی کوفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو انہوں نے ایک ''لاادری''[2] انسان پرست تنظیم موسوم بہ "Ethical Culture Movement" (اخلاقی ثقافت کی تحریک) میں شمولیت اختیار کر لی۔

اس تنظیم کی بنیاد انیسویں صدی میں فیلکس ایڈلر (Felix Adler) نے رکھی تھی۔ یہودی فقہ کا مطالعہ کرتے ہوئے ایڈلر کو یقین ہو گیا کہ دورِ جدید میں ہر قسم کے مافوق الفطرت نظریات سے پاک اور موزوں مذہب ہی کامیاب ثابت ہو سکتا ہے۔

میں گیارہ سال کی عمر سے اس نظریے پر مبنی اتھیکل کلچر ''سنڈے سکول'' جانے لگی اور پندرہ سال کی عمر تک وہاں تعلیم حاصل کی۔ اس بنا پر میں اس تحریک سے کلیتاً متفق ہو گئی اور تمام روایتی و مذہبی تنظیموں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگی۔

---

① کفارے یا جزا کا دن۔

② شک و شبہ میں گھرے ہوئے لوگوں کا نظریہ کہ ''ہم خدا اور کسی چیز کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔''

آغاز بلوغت کے تمام تر عرصے میں' میں انسان دوست فلسفے سے متاثر رہی حتیٰ کہ ذہن اتنا پختہ ہوگیا کہ میں دہریت اور عقلیت سے بیزار ہونے لگی۔ تب میں نے ازسرِ نو حقیقت و اصلیت کی جستجو شروع کردی۔ کچھ عرصہ تک میں نیویارک کے ایک بہائی گروہ موسوم بہ 'کاروانِ مشرق و مغرب' (The Carvan of East and West) میں شامل رہی جس کی قیادت مرزا احمد سہراب نامی ایک ایرانی کرتا تھا' جو 1958ء میں فوت ہوا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ عبدالبہا کا سیکریٹری رہ چکا ہے جو بہائی مذہب کے بانیان میں سے ایک تھا۔ میں ابتدا میں بہائی مذہب کی طرف اس لیے راغب ہوئی کہ میرے خیال میں یہ اسلام کا ایک فرقہ تھا اور انسانی وحدت کی تعلیم دیتا تھا مگر جب معلوم ہوا کہ وہ اسلامی نظریے کو زیرِعمل لانے میں کس قدر بری طرح ناکام رہے ہیں' تو ایک ہی سال بعد اس سے مکمل طور پر برگشتہ ہوکر ان لوگوں سے الگ ہوگئی۔ جب میں 18 سال کی تھی تو میں نے صیہونی نوجوانوں کی مذہبی تنظیم میں شمولیت اختیار کی' جس کا نام مزارچی ہیتزئیر (Mizarchi Hatzair) تھا۔ مگر جب مجھے صیہونیت کی اصلیت کا پتہ چلا جس نے عربوں اور یہودیوں کو ایک دوسرے کا مستقل دشمن بنادیا تھا' تو کچھ ماہ بعد اس تنظیم سے متنفر ہوکر میں نے اسے بھی چھوڑ دیا۔

جب میری عمر 20 برس ہوئی اور میں نیویارک یونیورسٹی میں زیرِتعلیم تھی تو میرا ایک اختیاری مضمون ''یہودیت اور اسلام'' تھا۔ میرے پروفیسر ربی ابراہام آئزک کیٹش (Prof. Rabbi Abraham Isaac Katsh) وہاں شعبۂ عبرانیات کے سربراہ تھے۔ انہوں نے تمام طلبہ کو اس بات کا قائل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ اسلام یہودیت ہی کے بطن سے پیدا ہوا۔ ہماری نصابی کتاب بھی انہی کی لکھی ہوئی تھی جس میں مصنف نے بڑی محنت سے قرآن حکیم کی ایک ایک آیت کا منبع و ماخذ یہودی تعلیمات قرار دینے کی کوشش کی تھی۔ اگرچہ ان کا اصل مقصد تو اسلام پر یہودیت کی برتری ثابت کرنا تھا مگر مجھ پر ان کی تدریس کا اثر اس کے بالکل برعکس ہوا۔ مجھے خاص طور پر اس بات نے یہودیت سے متنفر کیا کہ واضح قرآنی تصوّر آخرت (یوم حساب و مابعد) کے باوجود یہودی فلسطین کی ملکیت کو اپنے لیے اللہ تعالیٰ کا انعام

اور اپنا حق سمجھتے تھے۔

عہد نامۂ قدیم (توراۃ) اور یہودی دعاؤں کی کتاب میں مذکور یہودیوں کے خدا کا کردار مسخ کر کے اسے پراپرٹی ڈیلر کی حیثیت دے دی گئی ہے (نعوذ باللہ)۔ میرے خیال میں یہودیوں نے نسلی امتیاز پر مبنی قومیت کو مذہب میں ضم کر کے یہودیت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ میں یہ سمجھتی تھی کہ انتہائی متعصب یہودیت کا سبب وہ سختیاں ہیں جن کا یہ قوم ہمیشہ نشانہ بنی رہی۔ میں نے سوچا اگر یہودی بھی دوسرے مذاہب کی طرح ان مذاہب سے وابستہ لوگوں کو اپنے مذہب کی جانب راغب کرنے کی کوشش کرتے تو ان مصائب سے بچ جاتے۔ تاہم جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ صہیونیت محض یہودیت کے نسلی اور قبائلی تعصبات اور لادینیت کا مجموعہ ہے۔ صہیونیت کی وقعت میری نظر میں اس وقت اور بھی کم ہو گئی جب مجھے معلوم ہوا کہ صہیونیت کے رہنماؤں میں سے شاذ و نادر ہی کوئی شخص اپنے مذہب کی پابندی کرتا ہو اور قدامت پرست وروایتی یہودیت کو اسرائیل میں جس قدر برا سمجھا جاتا ہے دنیا میں اس کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ جب میں نے یہ دیکھا کہ امریکہ میں موجود یہودیت کے تمام اہم رہنما صہیونیت کے اندھے حامی ہیں جن کا ضمیر انہیں فلسطینی عربوں سے روا رکھی جانے والی خوفناک ناانصافی پر ذرا بھی ملامت نہیں کرتا تو میں نے خود کو یہودی سمجھنا ترک کر دیا۔

نومبر 1954ء کی ایک صبح پروفیسر کیٹش (Katsh) نے اپنے لیکچر کے دوران میں یہ دلیل پیش کی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے توحید کی جو تعلیم دی اور سینا کے مقام پر انہیں جو قوانین الٰہیہ عطا کیے گئے ان کے بغیر تمام اعلیٰ اخلاقی اقدار کی استواری ناممکن ہے۔ ''ایتھیکل کلچر'' (Ethcal Culture) نامی دہریہ تنظیم اور دیگر الحادی فلسفوں کی تعلیم کے مطابق ضابطۂ اخلاق اگر خالصتاً انسان کی تخلیق ہو تو اسے انسان اپنی مرضی سے کسی بھی وقت بدل سکتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ فرد اور معاشرہ دونوں کی ہلاکت، تباہی اور بربادی ہے۔

پروفیسر موصوف نے یہ دلیل پیش کی کہ تالمود میں ربیوں (یہودی فقہاء) نے آخرت کے بارے میں جو نظریہ پیش کیا ہے وہ محض خوش فہمی نہیں بلکہ ایک اخلاقی تقاضا ہے۔ انہوں نے کہا

کہ جو لوگ کامل یقین رکھتے ہیں کہ ہم میں سے ہر شخص کو روز قیامت اللہ کے حضور پیش ہو کر اپنے دنیاوی اعمال کا جواب دینا ہے اور ان کے مطابق سزا یا جزا ملے گی' صرف وہی لوگ خود پر اتنا ضبط رکھتے ہیں کہ عارضی خوشیاں قربان کر سکیں' مشکلات برداشت کر سکیں اور دائمی فلاح حاصل کرنے کے لیے قربانی دے سکیں۔ پروفیسر کیٹش یہ لیکچر دے رہے تھے تو میں اپنے ذہن میں عہد نامہ قدیم (توراۃ) اور تالمود کی تعلیمات کا قرآن وحدیث کی تعلیمات کے ساتھ موازنہ کر رہی تھی اور مجھے یہودیت میں اتنے نقائص نظر آرہے تھے کہ بالآخر میں نے دل سے اسلام قبول کر لیا۔

اگرچہ میں 1954ء ہی میں مسلمان ہونا چاہتی تھی مگر میرے گھر والوں نے مختلف دلائل دے کر مجھے اس سے محروم رکھا۔ مجھے خبردار کیا گیا کہ اگر میں نے اسلام قبول کر لیا تو میری زندگی کئی الجھنوں سے دوچار ہو جائے گی کیونکہ یہودیت اور عیسائیت کی طرح اسلام امریکہ میں پذیرائی حاصل نہیں کر سکا۔ مجھ سے کہا گیا کہ اسلام مجھے میرے اہل خانہ اور معاشرے سے جدا کر دے گا۔ اس وقت میرا ایمان اس قدر مضبوط نہ تھا کہ اس بے پناہ دباؤ کو برداشت کر سکتا۔

اس اندرونی کشمکش کی وجہ سے میں اتنی بیمار پڑ گئی کہ کالج کی تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا اور میں سند (ڈپلوما) حاصل نہ کر سکی۔ اگلے دو سال تک میں گھر پر ہی رہی۔ پرائیویٹ طور پر علاج ہوتا رہا مگر حالت مسلسل بگڑتی چلی گئی۔ میرے والدین نے بے بسی کے عالم میں مجھے دو سال 1957-59ء تک مختلف پرائیویٹ اور سرکاری ہسپتالوں میں داخل کرائے رکھا جہاں میں نے یہ عہد کیا کہ اگر مجھے شفائے کاملہ نصیب ہوگئی تو میں اسلام قبول کر لوں گی۔

جب مجھے گھر واپس آنے کی اجازت مل گئی تو میں نے نیویارک شہر میں مسلمانوں سے ملنے کے امکانات کا جائزہ لیا اور خوش قسمتی سے مجھے بہترین خواتین وحضرات کی شناسائی نصیب ہوگئی۔ میں اسلامی جرائد میں مضامین بھی لکھنے لگی اور دنیا بھر کے مسلمان رہنماؤں سے خط کتابت کے ذریعے سے رابطہ بھی کر لیا۔ جن معروف شخصیات سے میری خط کتابت رہی ان میں

الجزائری علماء کے رہنما مرحوم شیخ ابراہیمی' جامعۃ الازہر کے ڈاکٹر محمد البہائی' محمود ایف حب اللہ جو اُس وقت واشنگٹن میں اسلامی مرکز کے ڈائریکٹر تھے' پیرس میں مقیم ڈاکٹر حمید اللہ' جنیوا کے اسلامی مرکز کے ڈائریکٹر ڈاکٹر سعید رمضان اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔

باقاعدہ اسلام قبول کرنے سے قبل بھی مجھے یہ احساس تھا کہ آج کی دنیا میں ایمان کی سلامتی کو نام نہاد تحریکِ تجدّد سے شدید خطرہ لاحق ہے جو قوانین و تعلیماتِ الٰہیہ میں انسان کے گھڑے ہوئے نظریات اور ''اصلاحات'' کی ملاوٹ کرنا چاہتی ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اگر تمام جدت پرست اس پر تُل گئے تو اصل دین کا نشان تک باقی نہیں رہے گا کیونکہ بچپن میں' میں نے اپنے خاندان میں اپنی آنکھوں سے ''آزاد خیالوں'' کے ہاتھوں منزّل من اللہ عقیدے کو مسخ ہوتے دیکھا تھا۔ میں چونکہ ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوئی اور اسی ماحول میں پرورش پائی' لہٰذا میں نے یہ صاف دیکھ لیا کہ دہریت اور مادیت کے ماحول میں دین قبولیت حاصل نہیں کرسکتا۔ ''اصلاح یافتہ یہودیت''[1] نہ صرف یہودیوں کو غیر یہودی تمدن میں جذب ہونے سے روکنے میں ناکام رہی بلکہ اس عمل کی رفتار میں مزید اضافے کا باعث بنی۔

نتیجہ یہ نکلا کہ وہ لوگ صرف نام کے یہودی بن کے رہ گئے اور کسی کا کوئی خاص مسلک نہیں تھا۔ بچپن میں مجھے مسلسل ''اصلاح یافتہ یہودیت'' کی فکری بددیانتی' منافقت اور سطحی سوچ کا مشاہدہ اور تجربہ حاصل ہوتا رہا۔ اس کم سنی میں بھی مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ ایسا کمزور اور بے روح فلسفۂ حیات اپنے پیروکاروں خصوصاً بچوں کی عقیدت کا مرکز نہیں بن سکتا۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی کہ یہی خطرہ مسلمانوں کے ہاں بھی موجود تھا۔ مجھے یہ جان کر صدمہ ہوا کہ بعض مسلمان

---

[1] یہودیت کی ایک شکل جس میں رسوم، اطوار اور رواج وغیرہ کو اس طرح سے جدید بنایا گیا ہے کہ وہ حالات کے عین مطابق ہو گئے ہیں یعنی قدیم رسوم و رواج کی پابندی کے بجائے یہودیت کے مذہبی کردار اور اخلاقیات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

سیاسی رہنما اور علماء انہی گناہوں کا ارتکاب کر رہے ہیں جن پر قرآن حکیم میں یہودیوں کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ اس یقین کے ساتھ کہ اگر ہم نے خلوصِ دل سے توبہ اور اپنی اصلاح نہ کی تو ہمارا انجام بھی یہودیوں جیسا ہوگا، میں نے یہ عہد کیا کہ اس اندرونی خطرے کے خلاف بھرپور قلمی جہاد کروں گی۔ اس سلسلے میں جنوری 1961ء میں مولانا مودودی رحمہ اللہ نے میرے نام اپنے پہلے خط میں لکھا: ''جب میں آپ کے لکھے ہوئے مضامین کا مطالعہ کر رہا تھا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اپنے ہی خیالات پڑھ رہا ہوں۔ جب آپ اردو سیکھ کر میری کتابیں پڑھیں گی تو مجھے امید ہے کہ آپ کو بھی یہی محسوس ہوگا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ہمارے درمیان پہلے اگرچہ کوئی واقفیت موجود نہیں' پھر بھی یہ باہمی ہمدردی، موافقت اور اتفاقِ رائے اس وجہ سے ہے کہ ہم دونوں کو غور و فکر کی تحریک ایک ہی سرچشمہ یعنی اسلام سے ملی ہے۔''[1]

[بیگم مریم جمیلہ سابقہ مارگریٹ مارکس، نیویارک، حال مقیم لاہور]

(Maryam Jameelah Begum, Formerly Margaret Marcus)

میں مسلمان کیوں ہوں؟

آج سے چند ماہ قبل تک مجھے عیسائی شمار کیا جاتا تھا کیونکہ میں تقریباً 26 برس پہلے ایک عیسائی گھرانے میں پیدا ہوئی اور بچپن میں مجھے اچھی زندگی کے جو اصول سکھائے گئے تھے ان پر عمل کرتی رہی۔

سن بلوغت کو پہنچنے کے بعد قسمت نے مجھ سے کچھ زیادہ اچھا سلوک نہ کیا' لہٰذا مجھے کسی ایسی روشن اور قابل یقین چیز کی ضرورت محسوس ہوئی جو عیسائیت میں موجود نہ تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میں در در بھٹکنے لگی۔ میں چرچ صرف اس لیے جاتی تھی کہ میں وہاں برسرِ روزگار تھی' مگر روحانی طور پر سکون واطمینان سے محروم ہی رہی۔

چند سال قبل 27-1926ء میں' میں مصر گئی تو محض سیر و تفریح کے شوق میں قاہرہ کی مسجد محمد علی

[1] اسلام اینڈ ماڈرن ازم' از مریم جمیلہ- لاہور' 1968ء' ص: 7-12

دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میری خوش قسمتی یہ تھی کہ نماز کے وقت وہاں پہنچی۔ میں وہاں امیر وغریب دونوں کو یکساں خلوصِ دل سے اللہ کی عبادت کرتے اور نماز میں ان کا خشوع وخضوع دیکھ کر بہت متاثر ہوئی اور اس کے بارے میں بعد میں بھی سوچ کر حیران ہوتی رہی۔

خاصے عرصے بعد 1933ء میں مجھے ووکنگ (Woking) جانے کا اتفاق ہوا اور ایک دفعہ پھر سیاحت کے شوق میں وہاں کی مسجد میں جا پہنچی۔ اس وقت بھی نماز کا وقت تھا۔ اس کے بعد امام صاحب نے قرآن کریم کی اوّلین سورت پر لیکچر دیا جو ہر مسلمان کی نماز کا حصہ ہے اور ہر مسلک کے ہر شخص کے لیے ایک دعا ہے۔

مجھے وہاں عالمگیر اخوت، جس میں کوئی نسلی یا گروہی امتیاز نہیں، توحید، تمام سابق انبیاء علیہم السلام کے احترام اور اسلام کے صحیح مفہوم سے آگاہی حاصل ہوئی جو کہ سراسر پیغامِ امن وسلامتی ہے۔ یہ باتیں مجھے قابل اعتماد اور نہایت عمدہ لگیں اور میرے دل میں اس دین کے بارے میں مزید جاننے کی خواہش پیدا ہوئی جو اتنا قابل عمل اور تعصب سے پاک ہے۔ میں نے مسجد سے کچھ اسلامی کتب اور قرآن حکیم کا ایک نسخہ حاصل کیا۔ امام صاحب نے مجھے حق وصداقت کی تلاش میں بہت مدد دی اور بالآخر یہ صداقت مجھے مل گئی۔ آج سے تین ماہ قبل میں نے اسلام قبول کر لیا اور اللہ کی رضا کے سامنے سرِ تسلیم خم کر کے اپنے مسلمان ہونے کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔

میرا ایمان یہ ہے کہ قرآنِ کریم لامتناہی خزانے کا سرچشمہ ہے۔ اپنی زندگی میں ہر روز اس کی رہنمائی سے مستفید ہونے والا انسان کبھی گمراہ نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ لوگ کہتے ہیں اور میں خود بھی یہی سمجھتی ہوں کہ اب میں پہلے سے بہت زیادہ خوش رہتی ہوں، اگرچہ عقائد کی تبدیلی کی وجہ سے کئی آزمائشوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ مجھے تبدیلیٔ عقائد کی وجہ سے چرچ آف انگلینڈ کے ایک ادارے کی ملازمت چھوڑنی پڑ رہی ہے۔ جن عیسائی لوگوں کے ساتھ میں کام کرتی ہوں ان کے کچھ خیالات ونظریات پیش کرنے کی اجازت چاہتی ہوں۔ جہاں میں کام کرتی ہوں وہ نادار اور بے سہارا بچوں کا ادارہ ہے اور میں اس میں نائب ناظمہ ہوں۔ یہ بچے کسی خاص مسلک سے وابستہ نہیں۔

❁ محترمہ ''الف'' ہومز کمیٹی (Homes Committee) کی سیکرٹری ہیں۔ جب اس کمیٹی کو میرے نظریات کی تبدیلی کا علم ہوا تو ''محترمہ اے'' سے مجھے مندرجہ ذیل خط موصول ہوا:

محترمہ گرفتھس!

''آج ہاؤس کمیٹی کے علم میں یہ بات آئی ہے کہ آپ اسلام قبول کر کے ووکنگ (Woking) کی مسجد میں عبادات اور تقریبات میں شرکت کرتی ہیں، اس پر کمیٹی نے بہت افسوس کا اظہار کیا ہے۔

یہ بات ہومز کمیٹی کی اگلی میٹنگ میں بھی زیر بحث آئے گی' لہٰذا ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کیا آپ واقعتاً اسلام سے وابستگی اختیار کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں؟ اور میں یہ بات واضح کردوں کہ کمیٹی کی نظر میں آپ کا یہ اقدام ملازمت سے برطرفی کا مستوجب متصور ہوگا کیونکہ ہم کسی مسلمان کو یا مسجد میں حاضری دینے والے فرد کو اپنی ملازمت میں نہیں رکھ سکتے۔

مزید میں صرف یہ کہوں گی کہ مجھے سن کر بہت دکھ ہوا کہ آپ عیسائیت کو ترک کرنے پر غور کر رہی ہیں اور میں آپ سے یہ گزارش کرتی ہوں کہ یہ ناقابل تلافی قدم اٹھانے سے پہلے اچھی طرح سوچ بچار کرلیں۔''

آپ کی مخلص

ڈی سی ٹی ایچ

میں نے جواب میں لکھا کہ میں یہ ''ناقابل تلافی'' قدم اٹھا چکی ہوں' مگر میں نے مذہب کو ہمیشہ انسان کا ذاتی معاملہ ہی سمجھا ہے' لہٰذا میرے تبدیل شدہ عقائد سے میرا روزگار متاثر نہیں ہوگا اور جن بچوں کی بہبود کے لیے میں کام کر رہی ہوں ان کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

میرے خط کے جواب میں جو خط آیا افسوس کہ میں نے وہ جلا دیا۔ اس میں اس ''محترمہ'' نے لکھا تھا: ''بظاہر مذہب کو ذاتی معاملہ کہتے ہوئے آپ کو اپنے دائرۂ کار کا ہرگز احساس نہیں ہے کہ مسلمان ہوتے ہوئے آپ بچوں کی عیسائیت کی طرز پر کیسے تربیت کرسکیں گی۔''

۞ محترمہ ''ب'' اس کمیٹی کی ممبر ہیں اور نہایت باقاعدگی سے چرچ میں حاضری دیتی ہیں۔ جب انہیں یہ خبر موصول ہوئی تو اس قدر حیران ہوئیں گویا اچانک کوئی بم پھٹ پڑا ہو۔ انہوں نے خوف اور دہشت سے اپنے ہاتھ اٹھاتے ہوئے مجھ سے پوچھا: کیا آپ کو یہ علم ہے کہ آپ کیا کر رہی ہیں؟ کیا آپ پاگل ہوگئی ہیں؟ انہوں نے کہا کہ اسلام تو صرف رنگ دار لوگوں کے لیے انسانوں کا بنایا ہوا مذہب ہے۔

۞ محترمہ ''ج'' بھی کمیٹی کی ایک رکن ہیں جو کئی سال بنگال میں رہ چکی ہیں۔ وہ یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ بنگال کے جس ضلع میں وہ رہی ہیں وہاں مسلمانوں کو اتنا اچھا نہیں سمجھا جاتا کیونکہ وہ بے حد دیانت دار ہونے کے باوجود بے تحاشا جھوٹ بولتے ہیں۔ وہ کہتی ہیں: ''تمام طبقوں میں بیویوں سے منقولہ املاک جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ مرد اپنی ماں اور بہنوں وغیرہ کا احترام تو کرتے ہیں مگر بیویوں سے جو دل چاہے سلوک کرتے ہیں کیونکہ ان کا قرآن انہیں اس بات کی اجازت دیتا ہے۔''

میں نے قرآن کریم کھول کر اس میں بیویوں کے حقوق اور ذمے داریوں کے بارے میں عبارات پڑھیں تو اس خاتون کا جھوٹ صاف ظاہر ہوگیا۔

۞ مسٹر ''د'' کمیٹی کے ممبر ہیں جو بہت پڑھے لکھے ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر ہیں اور ایک مشہور پبلک ہائی سکول میں کام کرتے رہے ہیں۔ جب ان کی رائے دریافت کی گئی تو انہوں نے کہا: ''بے شک ہم جانتے ہیں کہ وہ (مسلمان) لامحدود جنسی تلذذ کے لیے جنت کی خواہش رکھتے ہیں۔''

کیا اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات بھی کوئی ہوسکتی ہے کیونکہ جسم کی موت کے ساتھ ہی اس کی ضروریات اور خواہشات بھی تو ختم ہو جاتی ہیں؟

۞ مسٹر ''ہ'' وہ پادری ہیں جنہیں مجھے ''راہِ راست'' پر لانے کے لیے بلایا گیا۔ انہوں نے فرمایا: ''کیا تمہیں یہ احساس نہیں کہ تم نے کتنا خوفناک قدم اٹھایا ہے؟ تمہارے اس قدم پر تو اس ادارے کی بانی خاتون کی روح بھی قبر میں تڑپ اٹھی ہوگی۔ کیا تمہیں احساس ہے کہ تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت سے منکر ہو رہی ہو؟''

میں نے جواب دیا: ''ہرگز نہیں! بلکہ میں تو اب بھی حضرت عیسیٰ' حضرت موسیٰ اور تمام انبیائے کرام علیہم السلام کا دل سے احترام کرتی ہوں' مگر میرا ایمان یہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری رسول ہیں۔''

انہوں نے کہا: ''تو کیا تم حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے برابر سمجھتی ہو؟'' میں نے کہا: ''جی ہاں! حضرت موسیٰ علیہ السلام احکام الٰہی لے کر آئے تھے اور اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا نہ ہوتے تو لوگ ان احکام پر عمل کر کے بھی زیادہ گمراہ نہ ہوتے۔''

انہوں نے کہا: ''مگر عیسیٰ علیہ السلام تو خدا کے (نعوذ باللہ) بیٹے ہیں۔''

میں نے ان سے اس بات کا ثبوت طلب کیا اور کہا: ''حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو خود کو انسان کے بیٹے کہا کرتے تھے۔''

اس پر ان صاحب نے یہ دلیل دی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو باپ کے بغیر پیدا ہوئے تھے۔ ان کی پیدائش تو ایک معجزہ تھی۔ میں نے اس معجزے سے انکار نہ کیا مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کو ماننے سے انکار کر دیا۔

انہوں نے کہا: ''کیا تم کبھی عبادت کرتی ہو۔'' میں نے جواب دیا: ''یقیناً!''

انہوں نے کہا: ''کس کی عبادت؟'' میں نے جواب دیا: ''صرف ایک معبودِ برحق کی۔''

انہوں نے کہا: ''تمہیں سیاہ فام لوگوں کے ساتھ میل جول برا نہیں لگتا؟''

میں نے جواب دیا: ''میں رنگ دار لوگوں کے ساتھ میل جول رکھنا برا نہیں سمجھتی کیونکہ میرا ان کے دین پر ایمان ہے جو عالمگیر اخوت کا درس دیتا ہے۔ اخوت کے اس رشتے کا اللہ کی طرف سے حکم ہے مگر اس پر صرف مسلمان ہی عمل کرتے ہیں۔''

❀ محترمہ ''ڈ'' میرے ادارے کی ناظمہ (Matron) ہیں جن سے میری گہری دوستی رہی ہے' مگر اب میں نے ان کی دوستی سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا: ''تم نے اسلام قبول کر کے اپنی تذلیل کی ہے اور اس وجہ سے میرے دل سے تمہارا تمام تر احترام جاتا رہا ہے۔''

انہوں نے مجھ سے پوچھا: ''کیا تم ان رنگ دار لوگوں سے خود کو برتر نہیں سمجھتی جن سے تم

ملتی جلتی رہتی ہو؟''

میں نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا: ''میں کبھی احساس برتری میں مبتلا نہیں ہوئی۔''

محترمہ ''ؤ'' کا موقف یہ ہے کہ اسلام ایک سیاسی پانسہ (پھانسنے کا ذریعہ) ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ اگر ہندوستانی (مسلمان) انگریزوں سے اپنا مذہب قبول کروالیں تو بہت جلد وہ ہندوستان پر خود حکومت کرنے کا مطالبہ کرنے لگیں گے۔ (اللہ جانے لوگ اسلام کو صرف ہندوستان تک محدود کیوں سمجھتے ہیں!)

میں نے دوٹوک الفاظ میں اس بات کی تردید کی تو انہوں نے محمد علی[1] کے ترجمۂ قرآن کے دیباچے سے چند پیروں کے مطالعے کی بنا پر کہا: ''اس کتاب کا بنیادی موضوع تو شہوت پرستی ہے اگرچہ اس میں کچھ عقائد اچھے بھی ہیں مگر لفظ اسلام گھٹیا باتوں پر اچھے لیبل کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ایسی باتیں جن کا نام لینے سے منہ کا ذائقہ تک خراب ہو جاتا ہے۔'' انہوں نے اسلام کے علماء اور مبلغین کو اس مکڑی سے تشبیہ دی جو جالا تان کر معصوم مکھیوں کا شکار کرتی ہے۔ انہوں نے کہا: ''کثرتِ ازواج کی آڑ میں وہ لوگ چاہتے ہیں کہ تم عصمت فروشی کی زندگی بسر کرو۔'' اندھے مسیحی تعصب میں مبتلا اس خاتون کو اس کے عقائد کے خلاف کسی بات کا قائل نہیں کیا جا سکتا۔

❀ جناب ''ز'' صاحبہ میری ایک عیسائی دوست ہیں جن کے اسلام کے بارے میں تصورات نہایت غلط ہیں۔ ان کے ایک حالیہ خط سے چند سطریں پیش کرتی ہوں:

''میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ تمہارا یہ اقدام نہایت غلط اور باعثِ ذلّت ہے کیونکہ مجھے تو دین اسلام میں کوئی کشش نظر نہیں آتی۔ یہ بنیادی طور پر ایک مشرقی مذہب ہے اور میرے خیال میں مغرب کی ایک تعلیم یافتہ خاتون کے لیے اس میں کشش کا کوئی سامان موجود نہیں۔ اس کا ہماری عیسوی تعلیمات سے کیا مقابلہ؟ Mahomet (ﷺ)[2] کا

---

[1] یہ لاہوری قادیانی فرقے سے منسلک تھے اور ان کا ترجمۂ قرآن (انگریزی) خاصا مشہور ہوا۔ (م ف)

[2] تُرک چونکہ حرف ''د'' (D) کو ''ت'' (T) کی طرح بولتے ہیں' اس لیے ان کے قرب کے باعث یورپ میں محمد ﷺ کے نام کے یہ ہجے رائج ہو گئے۔ (م ف)

خدا ایک جابر قسم کا سلطان یا مطلق العنان بادشاہ لگتا ہے جس سے ڈرنا اور اس کو خوش رکھنا نہایت ضروری سمجھا جاتا ہے مگر وہ کبھی باپ نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ اتنے زیادہ بُعد سے نبوت کا دعویٰ! کہاں خدا اور کہاں انسان! پھر بھی محمد (ﷺ) نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بڑے اطمینان سے یہ کہا تھا: ''میں اپنے باپ کی طرف سے آیا ہوں اور دنیا چھوڑ کر اسی کے پاس واپس جاؤں گا۔'' انہوں نے اپنے بے رحم نقادوں سے یہ بھی کہا: ''میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے تھا اور اب بھی ہوں۔'' یہ تمام فرمودات عالیہ عیسیٰ علیہ السلام کو انبیاء کے درجے سے اٹھا کر خدا کے درجے تک لے جاتے ہیں، گویا ایک انسانی شکل وصورت میں خدا (نعوذ باللہ)۔ میں اسلام کے پست معیار اخلاقیات کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں کہوں گی مگر اس سے انکار ممکن نہیں۔ اسلام میں عورت کا درجہ کم تر ہے۔ قرآن حکیم کثرت ازواج، غلامی بزور شمشیر مسلمان بنانے کی اجازت دیتا ہے، اور یہ تمام باتیں وحشیانہ ہیں......''

یہ وہ چند بے بنیاد الزام تھے جو اسلام اور مسلمانوں پر لگائے جاتے ہیں۔ روزانہ اس طرح کی کچھ باتیں مجھے سننا پڑتی ہیں۔ کچھ تو اتنی مضحکہ خیز ہوتی ہیں کہ ان پر توجہ دینا بھی فضول ہوتا ہے۔

اوپر چند الزامات کا تذکرہ میں نے آپ کے سامنے رکھا ہے، یہ الزام تراشیاں سراسر بے بنیاد ہیں کیونکہ کسی ایک الزام کی تائید میں بھی بیّن ثبوت موجود نہیں۔ اس طرح میرا اپنے عقائد پر ایمان مزید پختہ ہوگیا ہے، مگر ان لوگوں پر افسوس ہوتا ہے جو تعصب کے باعث اسلام کی واضح اور روشن صداقتوں کو سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ امید ہے کہ ایک دن وہ بھی ضرور ایمان لے آئیں گے۔

علاوہ ازیں مجھے اپنے مسلمان ہونے پر فخر ہے اور اس پر رب کریم کا شکر ادا کرتی ہوں۔ اسلام پر میرا ایمان کبھی زائل نہیں ہوگا۔ الحمد للہ [1]

[مس رحیمہ گرفتھس]
(Miss Rahima Griffths)

---

[1] اسلامک ریویو دسمبر: 1943ء ج: 21، ش: 12، ص: 405-410

اسلام ہی سے میرا عہد وفاداری کیوں؟

میں روس کے ایک تاتاری گاؤں[1] میں پیدا ہوئی۔ میرے والد رومن کیتھولک ڈاکٹر تھے جو پولینڈ سے جلاوطن ہوکر یہاں آباد ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک مسلمان خاتون سے شادی کرلی جوان سے شادی کی خاطر عیسائی بن گئیں کیونکہ روس میں عیسائیوں اور غیر عیسائیوں کے درمیان شادی بیاہ کی اجازت نہ تھی۔ میری والدہ کبھی چرچ گئیں نہ کہیں مذہبی تقریب میں شمولیت کی۔ مجھے یاد ہے کہ جب کبھی وہ تنہا ہوتیں تو زیرلب مسلمانوں والی دعائیں پڑھتی رہتی تھیں۔ میں نے مسجد کے سائے میں پرورش پائی اور میرے بچپن کی تمام تر یادیں مؤذن کی صدا سے وابستہ ہیں۔ تاتاری گھر میں اور کھیتوں میں نماز ادا کرتے تھے اور میں ان کے سنجیدہ' باوقار اور صاف ستھرے اندازِ حیات کا ہمسایہ روسی دیہات کے لوگوں کی شراب نوشی اور وحشت اور غلاظت سے غیر شعوری طور پر موازنہ کیا کرتی تھی۔

میرے والدین میرے بچپن ہی میں فوت ہوگئے اور میری پرورش لادین روسی دانشوروں کے ماحول میں ہوئی جن کے کوئی اصول تھے نہ روایات۔ میں یہ تسلیم کرتی ہوں کہ میں نے روحانی معاملات پر کبھی غور نہ کیا تھا' تا آنکہ امریکہ اور برطانیہ میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد مجھے یہ یقین ہوگیا کہ انسانی زندگی کے لیے کوئی اصول اور ضابطۂ اخلاق ضروری ہے۔ میں نے عیسائیت کا مطالعہ کیا مگر اس کی تمام نمائشی رسوم اور توہمات کے جال سے محفوظ ہونے کے باوجود یہ مذہب مجھے مطمئن نہ کرسکا کیونکہ میں عیسائیت کا بنیادی فلسفہ (عیسیٰ کی الوہیت' انسان کا پیدائشی برا ہونا اور نظریۂ کفارہ) قبول نہ کرسکی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ عیسائیوں کے غلط

---

[1] تیرھویں صدی عیسوی میں چنگیز خاں کے تاتاری لشکر نے روس پر یلغار کرکے وہاں ''شاخ زریں'' کی حکومت قائم کرلی تھی۔ اگلی صدی میں وہ تاتاری مسلمان ہوگئے۔ سولھویں صدی میں زار روس نے تاتاری حکومت پر فتح پائی اور ان دنوں تاتارستان کی مسلم اکثریتی خودمختار جمہوریہ وفاق روس میں شامل ہے۔ (م ف)

عقائد نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقام معبودِ برحق سے بھی بڑھا دیا ہے۔ مجھے یہ بات بھی ہرگز قابل قبول نہ لگی کہ کسی نیک ترین انسان کی موت بھی باقی انسانوں کے گناہوں کا کفارہ ہو سکتی ہے۔ اسی غلط عقیدے کی بنا پر لوگ بے دریغ گناہ کرتے ہیں' لہٰذا قدرتی طور پر میں نے اسلام کی طرف رجوع کیا' اس لیے کہ مجھے اسلام سے ہمیشہ ایک لگاؤ سا رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میری ابتدائی پرورش اسلام ہی کے ماحول میں ہوئی۔ مجھے اسلام کی طرف آنا اپنے ہی گھر کی طرف آنا لگا۔ اور میں جوں جوں قرآن پاک اور دوسری اسلامی کتب کا مطالعہ کرتی گئی (ان کتب میں سب سے سلیس اور مدلّل خواجہ کمال الدین کی کتب تھیں) تو مجھے اتنا ہی زیادہ یہ یقین ہوتا گیا کہ اہل فکر ونظر کے لیے...... جو حقائق سے آنکھیں چراتے ہیں نہ سائنس کی دریافتوں کو مسترد کرتے ہیں...... یہی سچا دین ہے' لہٰذا میں بے اختیار اِس دین سے عیسائیت کی تعلیمات کا موازنہ کرنے لگی جو لفاظی کے باوجود زندگی سے بیزاری کی حد تک رہبانیت کا درس دیتی ہیں یا انسانوں کی ارضی زندگی سے مطابقت کے لیے بے سروپا منطق کا سہارا لینے کی راہ دکھاتی ہیں۔

اسلام کی عقلی دلائل سے مزین تعلیمات سے بھلا مسیحی تعلیمات کا کیا مقابلہ؟ کیونکہ اسلام تو اللہ کی مرضی کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے اور درجۂ کمال کو پہنچنے کے لیے محنت کرنا سکھاتا ہے۔ اس میں فلسفیانہ دقائق کی بھول بھلیاں ہیں نہ نجات کے لیے کوئی طلسماتی فارمولے بلکہ زندگی بھر کے لیے ایک مکمل رہنمائی اور ضابطۂ اخلاق ہے جو عقلی شواہد کی تردید کرتا ہے نہ فطری جذبات کے خلاف ہے۔ اس بات کی سمجھ نہیں آتی کہ کوئی صاحبِ شعور انسان اس سے کیوں کر منکر ہو سکتا ہے؟ شاید اسی وجہ سے اسلام پر نقد وجرح کرنے والے اکثر ناقدین مسلمانوں کے ممالک میں ان کی زبوں حالی کو دلیل بناتے ہیں، مگر اس امر کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی زبوں حالی اسلامی تعلیمات کے باعث نہیں بلکہ غربت اور جہالت کی وجہ سے ہے جو ان ممالک کے مخصوص مادی وسیاسی حالات کی پیداوار ہے جہاں وہ رہتے ہیں۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ مجھے یہ سچائی پہلے کیوں نظر نہ آئی؟ اس سے میری ابتدائی زندگی بھی زیادہ خوشگوار ہو جاتی اور

میں معاشرے کی ایک زیادہ کارآمد رکن بن سکتی۔ ①

[مسز سی سعیدہ نیمیئر]

(Mrs. C.Sa'eeda Namier)

میرے نئے دین اسلام کی خوشی

میں نے تقریباً 7 برس امریکہ میں عیسائی مشنری (مبلغہ) کے طور پر کام کیا تو مجھے احساس ہوا کہ مجھے اپنے طور پر تلاشِ حق کرنی چاہیے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ اللہ تعالیٰ مجھے میرے سوالات کے جوابات کی تلاش میں کہیں لے جا رہا ہے۔ میں ہمیشہ سے بیرون ممالک جانے کی خواہاں تھی اور بالآخر میں نے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں پہلے جرمنی گئی جہاں مجھے میرے شوہر ملے جنہوں نے مجھے اسلام سے متعارف کروایا۔ ہم دونوں اکٹھے پاکستان گئے جہاں میں ''ماہجی'' (Mahji) نامی گاؤں میں تقریباً ڈیڑھ سال تک رہی۔ یہ سفر یقیناً میرے لیے ایک بہت بڑا انقلاب تھا کہ مجھے ان بڑے بڑے شہروں سے میلوں دور رہنا پڑا جہاں میں پہلے رہتی رہی۔ یہاں کے لوگوں کی طرزِ زندگی نے مجھے متاثر کیا اور زندگی کے سفر میں اسلام کی شاہراہ پر ایمان کی دولت لیے گامزن ہونے پر ابھارا۔ اپنی سابقہ زندگی میں، میں یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ رہتی تھی مگر وہ اپنے ہی مقرر کردہ اصول وضوابط کے برعکس زندگی گزار رہے تھے۔ صرف پاکستان ہی میں مجھے ایسے لوگ ملے جو اپنے دینی معیار کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہیں۔

امریکہ میں پرورش پانے کی وجہ سے میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہاں کی بیٹیاں کس طرح جہنم کی راہ لیے ہوئے ہیں۔ وہاں کوئی پابندی ہے نہ کوئی اخلاقی معیار' لہٰذا لڑکیوں کو 18 سال کی عمر ہی سے اپنی راہیں خود تلاش کرنے کی کھلی چھٹی دے دی جاتی ہے۔ ایسے اعمال میں محبت کا کیا دخل؟ مگر پاکستان میں آپ کوئی لڑکی گلی میں اکیلی نہیں پائیں گے، والدین کا ان پر پورا کنٹرول ہے۔ اسلام کے مطابق مناسب عمر میں ان کی شادی کر دی جاتی ہے تو شیطان کے

① اسلامک ریویو' جنوری: 1935ء' ج: 23' ش: 1' ص: 1-3

حملے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ قدرت نے مجھے دو بیٹیاں عطا کی ہیں اور میں فخر سے یہ کہہ سکتی ہوں کہ وہ بڑی ہوں گی تو مذہب اسلام اور اسلامی اقدار ان کی عصمت کی محافظ ہوں گی اور انہیں اس اذیت سے دوچار نہیں ہونا پڑے گا جس کا سامنا مجھے کرنا پڑا۔ میرے خیال میں اسلام‘ ایمان اور پاکیزگی کی رُوح ہے۔ ابتدا میں حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے اس لیے نکلنا پڑا کہ وہ حوا کو شیطان کے دام سے نہ بچا سکے۔ اب ہم اسلام کے ذریعے سے ہی اپنی بیٹیوں کو شیطان سے بچا کر اور انھیں اللہ کے راستے پر ڈال کر اپنے آپ کو ناکامی سے بچا سکتے ہیں۔ میرا یہ ایمان ہے کہ آج کی دنیا کو راہ راست پر لانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اپنا منتخب دین بنا کر بھیجا ہے تاکہ یہ دنیا کے لوگوں کو خلافت ارضی کے اصل مقصد سے آگاہ کر کے انہیں اس کے حصول کی جدوجہد کی راہ دکھائے۔ آمین ①

[ورجینیا ہاجرہ میر]
(Virginia Hajarah Mir)

① یقین انٹرنیشنل‘ 17 اپریل: 1986ء‘ ج: 34‘ ش: 23‘ ص: 273

اسلام دینِ حق ہے۔ اس کے عقائد سچے اور خالص ہیں' اس کی عبادات سادہ اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں اور اس کے پیغمبر خاتم النّبیین حضرت محمد ﷺ ہیں جن کی سیرتِ مطہرہ بنی نوع انسان کے لیے اسوۂ حسنہ ہے' چنانچہ انگریز مصنف مائیکل ہارٹ تاریخ انسانی کے سو بڑے آدمیوں کی فہرست مرتب کرنے بیٹھا تو اس کو سرِ فہرست رکھنے کے لیے پیغمبر اسلام ﷺ کی ذاتِ ستودہ صفات کے سوا کوئی اور ہستی نظر نہ آئی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اپنی انسانیت نواز خوبیوں کے باعث روزِ اوّل سے مسلسل پھیلتا آ رہا ہے۔ آج دنیا بھر میں ایک ارب چالیس کروڑ کے لگ بھگ انسان اسلام کے حلقہ بگوش ہیں اور اس زمانے میں دیارِ مغرب میں اسلام کے فروغ کی رفتار بوجوہ تیز تر ہو گئی ہے' بالخصوص سانحہ نائن الیون کے بعد امریکہ اور یورپ میں قبولِ اسلام کی شرح فزوں تر ہے۔

''اسلام ہی ہمارا انتخاب کیوں؟'' ان خوش نصیب انسانوں کے تجربات و تاثرات اور قلبی واردات کا خوبصورت مرقّع ہے جنھوں نے عیسائیت' یہودیت یا ہندومت کے باطل عقائد و افکار کو تج کر اسلام کے باعثِ تسکینِ جاں اور بہارِ قلب و نظر کے حامل سرمدی سائے میں پناہ لی۔ ان نومسلموں کے اپنے سابق مذاہب کے حوالے سے اعترافات اور اسلام کے بارے میں سرور انگیز والہانہ جذبات حقیقتاً ایمان افروز اور ایقان پرور ہیں جن سے اس دینِ حنیف کی ازلی و ابدی سچائی روزِ روشن کی طرح نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔

یہ بے مثال کتاب ہر مسلمان بلکہ ہر انسان کے پڑھنے کی چیز ہے' بالخصوص وعظ و تبلیغ کے فریضے کی ادائیگی میں مصروف لوگوں کے لئے سوغات ہے۔ اسے خود پڑھ کر اسلام پر اپنا ایمان و یقین تازہ کیجیے اور دوسروں کو پڑھائیے کہ اسلام' قرآن اور پیغمبر اسلام ﷺ سے نومسلموں کی وابستگی کا تقابلی مطالعہ دل و نگاہ کو رفعت و صلابت اور کشادگی عطا کرتا ہے۔

دارُالسّلام
کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
ریاض جدہ شارجہ لاہور
کراچی لندن ہیوسٹن نیویارک
دارالسلام DARUSSALAM